اپریل ۱۹۵۸ء

محمد جعفر پھلواروی

قرآن میں موسیقی کا ذکر

جس وقت میں "اسلام اور موسیقی" لکھ رہا تھا اس وقت کئی بار قرآن پاک کی ورق گردانی اس نیت سے کی کہ کوئی آیت ایسی مل جائے جس میں اگر صراحۃً تو گانا بجانا ہی سہی حرمت غنا کا کوئی حکم موجود ہو۔ میری تلاش منفی قسم کی تھی۔ کیونکہ عام طور پر یہ سنا کرتا تھا کہ گانا بجانا ناجائز ہے۔ میری زندگی میں یہ تضاد بھی رہا ہے کہ بچپنے سے ہمیشہ قوالی اور دوسرے گانوں سے بغایت دلچسپی لیتا رہا ہوں۔ جہاں کوئی نئی دھن، نیا لہجہ اور نئے طرز کی کوئی چیز سنی اور اس کی نقالی شروع کر دی۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ میں بیمار پڑا اور مجھ بے ماں کے بچے کی بیماری سے سارا گھر پریشان ہو گیا۔ لیکن چند ہی دنوں میں میرے گھر کی بزرگ عورتوں نے فتوے لگا دیا کہ بس اب یہ روبصحت ہے۔ ان بزرگ عورتوں کے پاس میرے روبصحت ہونے کی ایک ہی دلیل تھی اور وہ یہ تھی کہ اب یہ بچہ آہستہ آہستہ گانے لگا ہے۔

اس پورے شغف کے باوجود مذہب کا بڑا گہرا نقش میرے دل پر ہمیشہ ابھرا رہا اور اپنی اس غنائی دلچسپی کے باوجود گانے بجانے میں ایک کراہت و حرمت محسوس کرتا رہا یا کم از کم خلاف تقوے سمجھتا رہا۔ اس تضاد کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جہاں ایک طرف بہت سے بزرگوں کو گانا سنتے دیکھتا تھا وہیں بہت سے بزرگوں کو اس سے کامل اجتناب کرتے بھی دیکھتا تھا۔ خود میرے گھر کا یہ حال تھا کہ میرے والد ماجد (حضرت مولانا شاہ سلیمانؒ) خوب قوالی سنتے تھے اور میرے ماموں جان (حضرت مولانا شاہ عین الحقؒ) اس سے کامل اجتناب فرماتے تھے۔ میرے دل پر آج تک ان دونوں کے علم و فضل اور زہد و تقوے کا ایسا سکہ بیٹھا ہوا ہے کہ غالباً مرتے دم تک اسے دور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکوں گا۔

یہ سن لیجئے کہ مولانا شاہ عین الحق اپنی خاندانی خانقاہ کی گدی چھوڑ چھاڑ کر "وہابی" یا اہل حدیث ہو گئے تھے لیکن چونکہ میرے والد ماجد کے پیر و مرشد کے صاحبزادے بھی تھے اس لئے وہ ماموں جان کی دست بوسی کرتے تھے حالانکہ ماموں ان سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ جب وہ ہوتے میرے والد نماز کا امام ان ہی کو بناتے تھے۔ بچپنے میں میں یہ سب باتیں دیکھا کرتا تھا کہ ایک گانا سننے والا اسے امام بنا رہا ہے جو گانا بجانا جائز نہیں سمجھتا اور اس سے سن میں چھوٹا بھی ہے۔ اس کا اثر میرے لاشعور پر یہی پڑ سکتا تھا کہ گانے بجانے سے احتراز کرنے والا زیادہ متقی ہوتا ہے ورنہ وہ کیوں امامت کرتا جبکہ وہ سن میں بھی چھوٹا ہے۔

اس کے بعد ایک تضاد اور بھی میرے سامنے آیا جس نے مدتوں مجھے پیچیدگی میں مبتلا رکھا۔ مولانا شاہ عین الحق ہو تو گئے تھے اہل حدیث مگر نتیجۃً وہ اہل حدیثوں کے بہت بڑے "پیر" بن گئے۔ نواب سید صدیق حسن خاں اور میاں سید نذیر حسین، مونگیری ثم دہلوی کے بعد شاید اتنا بڑا معزز کوئی اور اہل حدیث نہ ہوا ہو گا۔ یہ خود میاں صاحب کے شاگرد بھی تھے۔ اس اہل حدیثیت کے باوجود میں ایک تضاد یہ بھی دیکھا کرتا تھا میرے یہ ماموں جان قوالی کو ناجائز سمجھنے کے باوجود گراموفون خوب سنا کرتے تھے اور اسے جائز بتاتے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ غنا و مزامیر نہیں بلکہ صرف اس کی نقل ہے جو مقید کر لی گئی ہے۔ اور جو نقل ہے اصل پر ہو وہ نقل پر نہیں ہو گا۔ اگر ریکارڈ میں نماز بھر لی جائے تو اس کے پیچھے اقتدا جائز نہیں ہو گی کیونکہ اصل نماز اور اس کی مقید نقل کا حکم الگ الگ ہے۔ (موصوف کا یہ استدلال مزاحی انداز لئے ہوئے تھا۔ شرعی استدلال کیا تھا مجھے اس کا علم نہیں)۔

یہ تضاد میرے لئے اور بھی عجیب تھا۔ غرض میں ہمیشہ ایک کش مکش میں مبتلا رہا۔ فطری ذوق گانے کی طرف مائل کرتا تھا اور مذہبی خیال کبھی اس کی اباحت کی طرف لے جاتا اور کبھی اسے خلاف تقوے بتاتا۔ غرض "اسی کش مکش میں مری گزریں زندگی کی راتیں کہ:

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

کسی نے خوب کہا ہے:

خالِ او فتویٰ دہد از کعبہ در بت خانہ شو
زلفِ او دعویٰ کند گر عاقلی دیوانہ شو

اس "خال" اور اس "زلف" کا لطف وہی لے سکتا ہے جس نے ان دونوں بزرگوں کو دیکھا ہو۔

یہ کش مکش مدتوں جاری رہی تا آنکہ میں ندوۃ العلماء سے فارغ التحصیل ہو کر آ گیا۔ مگر اس سند فراغ کے باوجود "غنا و مزامیر" کے بارے میں یہی کش مکش رہی کہ:

از مدرسہ بہ کعبہ روم یا بہ میکدہ
اے خضر رہ بگو کہ طریقِ صواب چیست

پھر ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۷ء تک کپورتھلہ کی شاہی مسجد کا امام و خطیب رہا مگر اس دوران میں بھی اس کش مکش سے باہر نہ نکل سکا۔ پاکستان آنے کے بعد بھی عرصۂ دراز تک اسی الجھن میں رہا۔ اور یہی مسلسل کش مکش تھی جس کی وجہ سے میں نے قرآن کریم کو اسی منفیانہ نگاہ سے دیکھا۔ یعنی یہ گویا پہلے سے طے تھا کہ قرآن میں اس کے جواز کا کوئی اشارہ تو ہو گا ہی نہیں۔ لہٰذا اگر ہو گا تو عدم جواز ہی ہو گا۔ لہٰذا اسی کی تلاش کرتا رہا کہ وہ کون کون سی آیات ہو سکتی ہیں،

جن میں غنا و موسیقی کے ناجائز ہونے کا ذکر ہو۔ جن آیات سے بعض اہلِ علم نے اس کا عدم جواز نکالا ہے وہ میں نے "اسلام اور موسیقی" میں درج کردی ہیں لیکن ایمان کی بات یہ کہ ان اہلِ علم کے استدلال سے مجھے بالکل تسکین نہ ہوسکی اور اس کی وجوہ میں نے کتاب مذکور میں لکھ دی ہیں۔

"اسلام اور موسیقی" میں بھی میرا جو کچھ رجحان ہے وہ خود میری ذہنی کش مکش کا آئینہ ہے۔ اس میں دراصل ہم نے مختلف رائیں جمع کردی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اس باب میں تین مسلک ہیں:

۱۔ فقہاء عام طور پر اسے مطلقاً حرام بتاتے ہیں

۲۔ محدثین عام طور پر مطلقاً جواز کے قائل ہیں۔

۳۔ صوفیہ عام طور پر جواز کے قائل ہیں لیکن سخت شرائط کے ساتھ۔

میں نے کتاب میں یہ تینوں مسلک پیش کرکے فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنی صوابدید اور اپنے ذوق کے مطابق جس مسلک کو چاہیں پسند کرلیں۔ میری ذہنی کش مکش ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ "امروز" (لاہور۔ مؤرخہ ۱۶ فروری ۵۸ء) لکھتا ہے کہ:

..... اس قیمتی جائزے کے بعد (مصنف نے) اپنی رائے محفوظ رکھی ہے۔ ہماری رائے میں اس کتاب کی یہ کمی دراصل اس کی خامی ہے۔ مصنف خود ایک متبحر عالمِ دین ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے اسلام میں موسیقی کے مقام پر اپنا فیصلہ صادر کرسکتے تھے.....

فیصلہ تو میں دے چکا ہوں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس میں بھی کش مکش کی جھلک موجود ہے اور اسی کش مکش کی وجہ سے قرآن کو جب دیکھا تو اسی منفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھا کہ اس میں عدم جواز کا پہلو کہاں کہاں ہے۔

لیکن چند دن ہوئے اپنے ایک محترم دوست کی بدولت ایک مثبت تجسس بھی پیدا ہوا۔ یعنی یہ خیال آیا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ قرآن میں موسیقی و نغمات کا کوئی ذکر ہی نہیں درآں حالیکہ وہ زندگی کے بے شمار جمالیاتی گوشوں کا ذکر کرتا ہے۔ زمین سے آسمان تک، مجردات سے محسوسات تک، جوہر سے حیوانات بلکہ انسان تک اور پھر دنیا سے آخرت تک کے بے شمار جمالیات کا تذکرہ کرتا ہے مگر نغمہ و سرود کا کہیں ذکر تک نہیں کرتا۔ جنت اور جنتی زندگی کی تمام نعمتوں اور جمالیاتی پہلوؤں کو طرح طرح کے نئے نئے انداز سے بیان کرتا ہے اور موسیقی و غنا کی طرف توجہ بھی نہیں کرتا۔ کیا حسنِ سماعِ انسانی فطرت سے اس قدر دور ہے کہ اس کا ذکر تک نہ آئے؟

لیکن دو آیتوں نے میری الجھن دور کردی۔ پہلی آیت یہ ہے:

ادخلوا الجنۃ انتم وازواجکم تحبرون۔ (۴۳:۷۰)

تم اور تمہارے جوڑے جنت میں جاؤ جہاں تمہیں نغمے سنائے جائیں گے۔

دوسری آیت جو اسی مضمون کی ہے یہ ہے :

فاما الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت فھم فی روضۃ یحبرون ۔ (۳۰ : ۱۵)

جو لوگ ایمان لائے اور اس کے مطابق عمل کئے وہ چمن میں نغمے سن رہے ہوں گے ۔

"حَبْرَہ" کے معنی سرور کے بھی ہیں اور ہمیں اس سے انکار کی وجہ نہیں ۔ عام مترجمین یہی ترجمہ کرتے ہیں کہ وہاں مسرور ہوں گے ، مگن ہونگے ، خوش ہونگے ۔ لیکن امام شریف مرتضیٰ حسینی زبیدی تاج العروس ج ۳ ص ۱۱۸ میں ایک اور معنی لکھتے ہیں :

الحبرۃ بالفتح السماع فی الجنۃ وبہ فسر الزجاج الایۃ وقال ایضا الحبرۃ فی اللغۃ کل نغمۃ حسنۃ محسّنۃ ۔

حَبْرَہ (حا کے زبر سے) سے مراد بہشتی نغمہ ہے اور زجّاج نے آیت (مذکورہ بالا) کی یہی تفسیر کی ہے اور کہا ہے کہ "حَبْرَہ" لغت میں ہر اچھے گانے کو کہتے ہیں ۔

زجّاج لغت اور نحو کے اسی طرح امام ہیں جس طرح راغب اصفہانی (صاحب مفردات) ۔ اگر راغب کی رائے بطور سند پیش کی جاسکتی ہے تو زجاج کا قول بھی اسی طرح سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے ۔

البستان عربی کا سب سے آخری مستند لغت ہے جس کے مولف شیخ عبداللہ البستانی اللبنانی ہیں ۔ یہ حبرہ کے معنی لکھتے ہیں :

..... وکل نغمۃ حسنۃ محسنۃ ..... والسماع للانغام فی الجنۃ ۔

یعنی ہر عمدہ گانا ..... اور (خاص طور پر) جنّت میں گانوں کا سُننا ۔

پھر ہمارے دوست مولانا عبدالحفیظ بلیاوی استاذ ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء اپنی "مصباح اللغات" میں "حبرہ" کے معنی یوں لکھتے ہیں :

خوشی نعمت ۔ ہر عمدہ راگ ۔ یہی المنجد میں بھی ہے یعنی کل نغمۃ حسنۃ (ہر اچھا گانا)

اس کے علاوہ اس سے بڑی اور ناقابلِ انکار تفسیر حدیث ابو موسیٰ اشعری ہے جس میں یہ ہے کہ حضورؐ نے ان کی قرآن خوانی سُن کر فرمایا کہ :

لقد اوتیت مزمارا من مزامیر ال داؤد ۔ تمہیں تو لحن داؤدی عطا ہوا ہے ۔

یہ سُن کر ابو موسیٰ اشعری نے عرض کیا کہ : یا رسول اللہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ حضور میری قرآن خوانی کو سُن رہے ہیں تو :

لحبّرتہ لک تحبیرا ۔ (رواہ مسلم والنسائی عن ابی موسیٰ) میں اور زیادہ خوش الحانی سے پڑھتا ۔

"تجبیر" کے معنی "بحار الانوار" میں یوں لکھے ہیں:

یرید تحسین الصوت وتحزینہ۔ اس سے مراد خوش آوازی اور سوز و درد ہے

"مزمارا من مزامیر آل داؤد" کی تفسیر یہ ہے:

ماکان یترنم بہ من الاناشید والادعیۃ۔

حضرت داؤد جو اشعار یا دعائیں ترنم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

مزمار کی اس تفسیر کو "تجبیر" کی تفسیر کے ساتھ ملا کر دیکھئے تو "حبرہ" کے معنی خوش آوازی، خوش الحانی، ترنم اور نغمے ہی کے ہوں گے۔ اس لئے زجاج کی تفسیر کو محض مہمل سمجھ کر نظر انداز کر دینا قرین انصاف نہ ہوگا۔ ہمیں دوسری تفسیروں کو (جس میں تحبرون اور یحبرون کے معنی سرور یا نعمت کے بتائے گئے ہیں) غلط ٹھہرانے کا حق نہیں لیکن جس طرح زجاج کی تفسیر کو چھوڑ دینا کوئی گناہ نہیں اسی طرح دوسری تفسیروں کو نظر انداز کر کے زجاج کی تفسیر قبول کر لینا بھی کوئی معصیت نہیں۔ اور کیوں ہو جبکہ "نغمہ و سرود" بھی دنیا میں ہمیشہ سے "نعمت و سرور" کا جزو رہا ہے۔

اگر قرآن صاف لفظوں میں نغمہ و غنا کا ذکر نہیں کرتا تو اس سے اس کے نعمت و سرور ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ بے شمار دنیوی اور اُخروی نعمتوں کا قرآن نے ذکر کیا ہے لیکن پھولوں کے چمن اور تختہ ہائے گل کا صاف لفظوں میں کسی جگہ ذکر نہیں۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے پھولوں کی کیاری کوئی نعمت الٰہی نہیں؟ فی روضۃ میں اگر رنگ برنگ کے پھولوں کو بھی داخل مانا جائے تو تحبرون میں نغمہ و سرود کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ یہ صاف لفظوں میں دعوے کر دینا چاہئے کہ جنت میں اور تو ساری نعمتیں ہونگی لیکن جنت نگاہ پھول نہیں ہونگے۔ واقعہ یہ ہے کہ جنت میں وہ سب کچھ ہوگا جو یہاں مرغوب ہو سکتا ہے۔

ولکم فیہا ما تشتھی انفسکم ولکم فیہا ما تدّعون۔

تمہارا دل جو کچھ خواہش کرے گا اور تم جو کچھ مانگو گے وہ وہاں ہوگا

وہاں جس طرح بہشت نگاہ، خلد زبان اور دوسری جنتیں ہوں گی اسی طرح فردوس گوش بھی ہوگا۔ وہاں تمام حواس کی جنتیں ہوں گی۔ اور کانوں کی بھی جنت ہوگی اور وہ نغمہ و سرود ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے یحبرون کی زجاجی تفسیر بالکل قرین قیاس، مطابق عقل اور تقاضائے فطرت ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک فی صد سے بھی کم کور ذوق اور خشک زاہدوں کی خاطر خدا ننانوے فی صد سے زائد جنتیوں کو نغمہ و سرود کے ناقابل انکار لطف و نعمت سے محروم کر دے؟

اگر یہاں ازواج مطہرہ حلال ہیں تو بہشت میں بھی حلال ہونگے۔ اگر یہاں ایسی مے مباح ہے جس میں بکواس، دردِ سر اور نشہ نہ ہو تو وہاں بھی مباح ہوگی۔ اگر یہاں شیر و شہد، لحم طیر اور فواکہ جائز ہیں تو وہاں بھی جائز ہوں گے۔

جنت میں جو نعمتیں بھی حلال و مباح ہیں وہ یہاں بھی قطعاً حلال و مباح ہیں اور جن حدود کے ساتھ وہاں جائز ہیں۔ موسیقی و غنا اور نغمہ و سرود جیسے فردوسِ گوش کو انہی نعمائے الٰہی میں داخل نہ کرنے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے؟

شاید آپ کہیں کہ جنت میں ریشم، سونا وغیرہ جائز ہے لیکن یہاں جائز نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ چیزیں اس لئے یہاں ناجائز ہیں کہ اس سے معاشی عدل و توازن باقی نہیں رہتا۔ یہ سراسر ناانصافی ہے کہ معاشرہ انسانی میں ایک شخص ریشم پہنے اور دوسرے کو کھدر بھی نصیب نہ ہو۔ اگر کوئی دور ایسا آجائے جس میں سب کو سونا اور ریشم وغیرہ یکساں نصیب ہو تو اس کے جواز میں شک و شبہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جنت تو معاشرے کا ایک مثالی نصب العین ہے یعنی معاشرہ ایسا ہونا چاہیئے۔ اسی کوشش میں اپنی عمریں کھپا دو کہ انسان کو یہ ساری نعمیں حاصل ہوں لیکن صرف چند کو نہیں بلکہ سب کو کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم۔

یہ تو درمیان میں ایک دوسری بحث آگئی جس کا تعلق معاشرے کے معاشی عدل سے ہے۔ عرض صرف یہ کرنا تھا کہ قرآن کریم میں نہ فقط یہ کہ غنا کی حرمت کا کوئی حکم موجود نہیں بلکہ اس کے نعمت ہونے کا ذکر موجود ہے اور یہ اہل جنت کے لئے ایک بہت بڑا غذائی انعام ہے۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ کسی اور پرانے مفسر نے بھی یہ تفسیر لکھی ہے یا نہیں؟ نہ لکھی ہو تو اب لکھ لیجئے۔ قرآن کے حقائق کسی دور کی کتب تفسیر میں بند ہو کر نہیں رہ گئے۔ یہ قیامت تک جاری رہیں گے۔ تؤتی اکلھا کل حین باذن ربھا۔

اسلام اور موسیقی

مصنفہ شاہ محمد جعفر ندوی

تمام ذوق جمال رکھنے والے انسان حسن صورت کو جلوۂ الٰہی اور حسن صوت کو غذائے روح کہتے ہیں۔ اس فکر انگیز موضوع پر قابلِ قدر اور قابلِ غور معلومات کا نادر اور بیش بہا ذخیرہ۔

صفحات ۲۱۶۔ قیمت ۳/۱۲ روپے

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور